اردو کی شعری اصناف

غزل

غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی محبوب یا محبوبہ سے باتیں کرنا ہے۔ اس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ یہ شعر مطلع کہلاتا ہے۔ بعد کے شعروں میں صرف دوسرے مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ شروع سے اس صنف کا تعلق معاملات حسن و عشق سے لازمی طور پر رہا ہے لیکن دھیرے دھیرے اس کے دائرے میں وسعت بھی آئی ہے۔ زندگی اور زمانے یعنی حیات و کائنات کا شاید ہی کوئی مسئلہ ہوگا جس کا ذکر غزل میں نہ ہوا ہوگا۔ غزل ہماری واحد صنف ہے جو ہر زمانے میں مقبول رہی ہے اور ہر دور میں شاعروں نے اس میں اپنے دلی جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ غزل کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ چاہے جتنی طویل ہو لیکن اس کا شعر ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے لاتعلق ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دو مصرعوں میں شاعر اپنی بات اس طرح کہتا ہے کہ قطرے میں دریا بند ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان اشاراتی ہوتی ہے۔ کم سے کم لفظوں میں اہم اور گہرے خیالات پیش کرنے میں شاعر کی فن کاری کا امتحان ہوتا ہے۔ غزل کی زبان استعاراتی اور علامتی ہوتی ہے۔ یہاں جو تخلیقی الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کے معنی لغت میں نہیں ملتے۔ غزل کا فن مشکل بھی ہے اور نازک بھی۔ اردو میں غزل فارسی سے آئی۔ جنوب اور شمالی ہند کے اکثر شاعروں نے غزل کہی ہے۔ شمالی ہند میں 18 ویں اور 19 ویں صدی کو کلاسیکی اقدار اور فنّی بلندی کے لحاظ سے غزل کا سنہرہ زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ غزل کے شعرا کی کثیر تعداد ہے۔ چند اہم غزل گو کے نام اس طرح ہیں:

قلی قطب شاہ، ولی، سراج، میر، درد، سودا، مصحفی، ناسخ، آتش، مومن، غالب، داغ، اصغر، جگر، حسرت، فانی۔ جدید غزل گو شعرا میں فیض، فراق، خلیل الرحمٰن اعظمی، مجروح سلطان پوری، جذبی، ظفر اقبال، پروین شاکر، ناصر کاظمی اور شہریار قابل ذکر ہیں۔

نظم

نظم عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لڑی میں پرونا ہے۔ نظم کا شاعر بھی اپنے خیالات کو تسبیح کے دانوں کی مانند لفظوں کے دھاگے میں پروتا ہے۔ نظم میں شاعر کو یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات اور تجربات ومشاہدات قدرے تفصیلات کے ساتھ (جس کی گنجائش غزل کے فارم میں قطعاً نہیں ہوتی) بیان کرسکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہماری شعری تاریخ کے ہر دور میں نظمیں لکھی گئی ہیں، جن میں مثنوی، مرثیہ، قصیدہ سب شامل ہیں اس لیے کہ نظم کی ان تمام شکلوں میں حقیقی اور غیر حقیقی قصے، واقعے یا تجربے کو فنکارانہ انداز سے نظم کیا جاتا ہے۔ البتہ مغربی اثر سے 19 ویں صدی کے اختتام میں محمد حسین آزاد، حالی، شرر اور اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ کی تحریک پر نظم کا جو جدید تصور پیدا ہوا وہ اس معنی میں نیا اور دلچسپ تھا کہ یہ کسی خاص موضوع (theme) کا نہ تھا۔ علاوہ ازیں یہ فطری زندگی، کائنات کے مظاہر وممکنات اور شاعر کے داخلی احساسات کے لیے زیادہ موزوں اور پُر اثر اظہار تھا جس کی روایت ہمارے یہاں پہلے موجود نہ تھی۔ 18 ویں صدی میں صرف واحد مثال نظیر اکبرآبادی کی نظم کہی جاسکتی ہے لیکن وہ بھی جدید تخلیقی نظم کے بالمقابل نہیں رکھی جاسکتی اس لیے کہ ان میں تخیل کی رنگارنگی، فکر کی گہرائی، توانائی اور اپج نہیں ہے۔

ابتدا میں ہماری نظم غزل کی طرح ردیف وقافیے کی پابند تھی، لیکن دھیرے دھیرے اس کی ہیئت میں تبدیلی آئی (Blank Verse) شعری نظم جس میں قافیے کی قید نہیں ہوتی اور پھر آزاد نظم (Free Verse) جس میں ردیف وقافیے کے علاوہ مصرعے بھی چھوٹے بڑے ہوتے ہیں، ان کو مقبولیت حاصل ہوئی اور اس طرح نظم کا ایک آزاد وجود سامنے آیا۔ نظم کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اس میں ڈرامے کی طرح ابتدا، انتہا، عروج اور منطقی انجام بھی ہوتا ہے۔

جدید نظم میں جن شاعروں کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ان میں سے چند کے نام اس طرح ہیں:

آزاد، حالی، چکبست، اقبال، جوش، سردار جعفری، میراجی، ن م راشد، اختر الایمان، فیض، مخدوم، مجید امجد وغیرہ۔

قصیدہ

قصیدہ ہماری شعری اور ادبی تاریخ کا ایک اہم جزو رہا ہے۔ قصیدہ عربی لفظ قصد سے نکلا ہے جس کے معنی دل دار گودے کے بھی ہیں۔ عربی اور فارسی شاعری میں قصیدے کی روایت بہت قدیم اور مضبوط رہی ہے۔ قصیدہ ایک مسلسل نظم ہے لیکن اس کے کچھ فنّی تقاضے بھی ہیں۔ اس کے مطلع یا پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیے کی پابندی ضروری ہے، بعد کے تمام اشعار کے ثانی مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا بھی لازمی ہے۔ قصیدے کے اشعار کی تعداد کم از کم 21 اور زیادہ کی حد مقرر نہیں ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں تشبیب جسے تمہید بھی کہا جاتا ہے، گریز، مدح، دُعا اور خاتمہ شامل ہیں۔ قصائد عام طور پر بادشاہوں، امرا اور رؤسا کی شان میں لکھے گئے ہیں لیکن ہجویہ قصائد بھی لکھے گئے ہیں جو تعداد میں بہت

کم ہیں۔قصیدہ ایک مشکل فن ہے۔اس میں کمال حاصل کرنے کے لیے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ زبان، علوم وفنون، تہذیبی مظاہر اور تاریخ وثقافت کی گہری واقفیت رکھتا ہو۔اسی لیے بہت کم شعرا نے قصیدے لکھنے کی کوشش کی۔ اردو میں نعتیہ قصائد بھی لکھے گئے ہیں جن میں محسن کاکوروی (1826-1905) کی جدت طرازیوں کا جواب نہیں ہے۔جن شعرا نے قصائد لکھے ان میں سے چند کے نام اس طرح ہیں:

سودا، ذوق، غالب، مومن، انشاء، مصحفی، آتش اور ناسخ۔قصیدے کا تعلق چونکہ امارت اور سیاست سے تھا اس لئے جب تک جاگیرداری کا دور باقی تھا، قصیدہ بھی باقی تھا۔جمہوری دور میں اب اس صنف کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن قصائد میں علوم وفنون اور تہذیبی زندگی کی جو جھلکیاں ملتی ہیں ان کے سبب قصیدے کی اہمیت اور افادیت ہمیشہ باقی رہے گی۔

مثنوی

مثنوی عربی لفظ ہے جس کے معنی دو کے ہیں۔اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہر شعر علاوہ قافیے کے ہوتا ہے۔اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے۔کوئی تاریخی یا خیالی واقعہ، عشقیہ قصے، داستان اس کا موضوع ہوسکتا ہے۔بیان میں ربط وتسلسل ضروری ہے۔مناظر قدرت، موسم، تہذیب وثقافت کا ذکر اس کے مضامین میں شامل ہے۔فارسی میں مثنوی کی بڑی طویل اور عظیم روایت موجود ہے۔شاہ نامۂ فردوسی، سکندر نامہ اور مولانا رومؒ کی مثنوی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔جنوب میں مثنویاں کثرت سے لکھی گئی

ہیں مثلاً گلشن عشق از نصرتی، خاور نامہ، رستمی، یوسف زلیخا از ہاشمی، قطب مشتری از وجہی، سیف الملوک از غواصی اور پھول بن از نشاطی وغیرہ۔ میر حسنؔ کی مثنوی سحر البیان، دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم اور مرزا شوقؔ کی زہرِ عشق خالص منظوم عشقیہ قصّوں کا بیان ہیں جو بے حد دلچسپ ہیں۔ مثنوی کی ہیئت میں اردو میں بعد میں بھی کچھ نظمیں لکھی گئیں جن میں اقبال اور سردار جعفری کی نظموں کے علاوہ حفیظ جالندھری کے شاہ نامۂ اسلام کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ مثنوی نگاری بھی ایک فن ہے اور اس کے فنّی تقاضوں میں پلاٹ، کردار نگاری، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری، مرقع نگاری، منظر نگاری، سراپا نگاری وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مثنوی کے لیے کچھ خاص بحر اور وزن ہیں جس کی پیروی ضروری ہے۔

مرثیہ

جس نظم میں کسی کی موت پر اظہارِ رنج و غم کیا جائے اسے مرثیہ کہتے ہیں۔ شروع کے چار مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ بقیہ دو مصرعے جن میں پہلے کے چار مصرعوں سے مختلف ردیف و قافیے کا استعمال ہوتا ہے۔ اسے اصطلاح میں بیت کہتے ہیں۔ تاہم وہ نظمیں جو معصومین شہدائے کربلا کے بارے میں لکھی گئی ہیں، زیادہ تر ایسی ہی نظموں کو مرثیہ کہا گیا ہے۔ مرثیہ کی روایت ہماری ادبی تاریخ میں بہت قدیم ہے۔ جنوبی ہند میں کثرت سے مرثیے لکھے گئے۔ شمالی ہند میں بھی مرثیے کا بہت بڑا سرمایہ ملتا ہے، تاہم مرثیے کی تاریخ میں جو کارنامے انیس اور دبیر نے انجام دیے کسی سے نہ بن پڑے۔ مرثیے کے اجزا میں تمہید، دُعا، تلوار اور گھوڑے کی تعریف، جنگ کے مناظر، شہادت، بین (گریہ وزاری) شامل ہیں۔ یعنی مرثیوں میں اشعار کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔ اس لحاظ سے اس میں اشعار کی قید نہیں ہے۔ اردو میں شخصی مرثیے بھی کافی لکھے گئے ہیں جو بہت پُر اثر ہیں، خصوصاً حالی کا

مرثیہ غالبؔ بے حد اہم ہے۔

******

Source: MANUU Study Material